مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب

(ایک جائزہ)

از

علامہ پیر سید نصیر الدین نصیر گولڑوی

ادارہ طلوعِ مہر، درگاہ غوثیہ مہریہ، گولڑہ شریف، سیکٹر E11، اسلام آباد

تمام پڑھنے والوں سے عاجزانہ درخواست ھے کہ میرے بچوں کی صحت اور تندرستی کیلئے دعا فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہر مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا فرمائے۔ آمین

نیاز مند۔ فاروق حسین گولڑوی

باسمِ تعالیٰ

معیارِ شرافتِ نسب ، پیسہ ہے
لوگوں میں فضیلت کا سبب، پیسہ ہے
بس کہنے کی حد تک ہیں اللہ و رسُول
اِس دَور کے انسان کا رب، پیسہ ہے
(نصیر)

ہر دَور کے انسان پر مال و دولت کی محبت غالب رہی، کسی دَور کا انسان اس کی محبت سے دامن نہ چھڑا سکا چنانچہ ہر عہد میں بڑے بڑے فتنے اور قتل و فساد کے ہنگامے برپا ہوئے، قریبی رشتے ٹوٹے، انسانی رشتۂ اخوت منقطع ہوا، مذہبی منافرت پھیلی، مختلف مسالک معرضِ وجود میں آئے۔ دوستی اور وفا کے دیرینہ بندھن شکستہ ہوئے، بچشمِ غور دیکھا گیا تو اس قسم کے تمام حادثات کی اصل، دنیا کی لالچ اور مال و دولت کی محبت قرار پائی۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا مالک و خالق ہے، وہ اپنی ہر تخلیق کے مزاج اور رجحان کا بخوبی علم رکھتا ہے، اس لیے اُس نے انسان کے بارے میں اپنا فیصلہ اِن الفاظ میں سنایا:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ کہ ”انسان مال و دولت کی محبت میں بہت پکا ہے“۔

یعنی کچھ بھی کہتا یا بنتا پھرے، مال کی محبت اس کی سرشت سے نکل نہیں سکتی، مال کے حصول کے لیے انسان کیا کیا بھیس بدلتا ہے، دنیادار، دنیاداری کا لبادہ اوڑھ کر اور مذہبی لوگ مذاہب و مسالک کے مختلف لبادے اوڑھ کر اسے حاصل کرنے میں سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ شاہانِ وقت کی ہوسِ ملک گیری بھی اسی حرص کا ایک رُخ ہے۔

قرآنِ مجید میں حبِّ دنیا اور حرصِ مال کے متعلق کثیر تعداد میں آیاتِ بیّنات ملتی ہیں، جن میں دنیا اور اس کی حرص کو ایک خفیف عمل قرار دیا گیا۔ اور ساری دنیا اور اُس کی دولت کو متاعِ قلیل سے تعبیر کیا گیا۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ انسانوں کی اکثریت مال اور جمعِ مال کے دام میں گرفتار ہے، اس میں رنگ و نسل، علاقہ، زبان، مذہب اور طبقاتی اونچ نیچ کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں۔ ہاں حرصِ دنیا اور حبِّ مال کے دام سے وہ عالی فطرت طبقات بچ نکلے، خالقِ ارض و سماوات نے جن کے قلوب میں ازل سے اپنی محبت و انابت ڈال دی تھی۔ اُن میں سرِفہرست انبیاء مرسلین اور پھر اُن کے اسوہ حسنہ پر گامزن رہنے والے اولیاء و صالحین ہیں۔ چنانچہ سورہ صٓ میں سلیمان علیہ السّلام کے لیے ارشاد ہوا:

فَقَالَ اِنِّیٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ، کہ (بتقاضائے بشریت) ”مال کی محبت نے مجھے اپنے رب کے ذکر سے باز رکھا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا“۔

یعنی میں نمازِ عصر بروقت ادا نہ کر سکا۔ سلیمان علیہ السّلام کے دل میں گھوڑوں کی محبت بشری تقاضے کے مطابق تھی، چنانچہ آپ اُن کو دیکھنے میں مصروف رہے مگر جب نماز فوت ہو جانے کے غم نے شدت اختیار کی تو قرآنِ مجید نے اُسے اِن الفاظ میں بیان فرمایا:

رُدُّوْهَا عَلَیَّ فَطَفِقَ مَسْحاً بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝ سلیمان علیہ السّلام نے حکم دیا کہ جن گھوڑوں کی مشغولیت نے مجھے ذکرِ رب سے روکا، اُنھیں دوبارہ پیش کیا جائے۔ مفسّرین نے اُن کی تعداد بیس ہزار (20,000) لکھی ہے چنانچہ دوبارہ گھوڑے آپ کے سامنے لائے گئے۔ آپ نے اُن کی گردنیں اور پاؤں کاٹ دیے۔ ثابت ہوا کہ اگر نبی کی فطرت میں حبِّ دنیا داخل ہوتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، مال و متاع کی ظاہری کشش نے بشری تقاضے کی بنا پر اُن کے دل میں وقتی رغبت ڈال دی، مگر انابت الی اللہ اور محبتِ معبودِ برحق کے فطری جذبۂ صادق نے اُن کے دل میں پیدا ہونے والی عارضی رغبتِ دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ آپ نے کروڑوں اربوں روپے کی مالیت کے گھوڑے قتل کر دیے۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے اس منصوص واقعہ سے یہ حقیقت

واضح ہوگئی کہ انبیاء علیہم السلام میں بشریّت بھی ہوتی ہے اور نورانیت بھی۔ اور یہ کہ اُن کی نورانیت اُن کی بشریّت پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ عبادِ صالحین یعنی وہ طبقہ جنھیں عرف میں اولیاء اللہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، درجۂ نبوّت ورسالت پر فائز نہیں ہوتے، اس لیے اُن میں انبیاء کی نسبت بشری تقاضے زیادہ اور غالب ہوتے ہیں، مگر زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت، خلافِ نفس اور کثرتِ ذکر کے سبب وہ اپنے اندر اس قدر نورانیت اور محبتِ الٰہیہ کی طاقت پیدا کر لیتے ہیں کہ اُن کے بشری تقاضے مغلوب اور محبتِ الٰہی اُن پر غالب آجاتی ہے اور اس طرح وہ درج ذیل شعر کا مصداق بن جاتے ہیں ۔

زخم سے تیرِ نظر کے دل کا رستہ کُھل گیا
صاف آتا ہے نظر اب رُوئے جانانہ مجھے

دنیا کی محبت دل سے نکالنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں، کیوں کہ یہ ایسی بلا ہے، جس سے جان چھڑانے میں بندگانِ خاص کو بھی سال ہا سال کی کٹھن ریاضتوں اور کاملین کے فیوضِ صحبت کے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دل کے آنگن کو ماسوی اللہ کی رغبت سے خالی کرنا پڑتا ہے، پہلے دل کو ویران اور پھر اُسے محبوبِ حقیقی کی یاد اور اُس کے ذکر سے آباد کرنا پڑتا ہے۔ بقول راقم الحروف ۔

پہلے تنہائی کی ناگن ڈستی ہے برسوں
پھر جا کر دل کے آنگن میں میلا لگتا ہے

انتہائی مشق ومشقت کے بعد ایسے انسانوں کے دل اَ لَابِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب کی جلوہ گاہ بنتے ہیں۔

عام انسانوں کی حرص اور دنیا سے اُن کی محبت کے بارے میں قرآنِ مجید نے بڑے واضح انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ، مال کو جمع کرتا اور پھر اُسے گنتا ہے، یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ روپے گننے کے بعد انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اب مال کی کثرت اُسے مرنے نہیں

دے گی بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ ایک اور مقام پر انسان کی خوئے حرص کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا: كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۔ "خبردار تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور دوسروں کو مساکین کے کھانا کھلانے پر اکساتے نہیں، اور وراثت کا مال ناحق چٹ کر جاتے ہو اور مال ودولت سے بہ شدّت محبت کرتے ہو"۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا: كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ "خبردار: تم دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑنے والے ہو"۔ اِن تمام آیاتِ قرآنیہ اور اِن کے علاوہ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں دنیا سے انسان کی والہانہ محبت کا ذکر آیا ہے اُن کے مجموعی مطالعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ طبقۂ خواص کو چھوڑ کر انسانوں کی اکثریت حرصِ دنیا کی لپیٹ میں ہے اور دنیا کے حصول کی خاطر انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔

حضور علیہ السلام کی ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھے اپنی اُمت کے بارے اس بات کی ہرگز فکر نہیں کہ وہ کسی ستارے، بت یا انسان کی پرستش کرے گی، بلکہ فکر اس بات کی ہے کہ وہ مال ودولت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کو قتل کرے گی، فساد برپا کرے گی اور ایک دوسرے کا خون بہائے گی۔ قرآن وسنّت کی روشنی میں انسان کی اِس خوئے ہوس اور دنیا پرستی کا اگر بچشم انصاف تجزیہ کیا جائے تو آج کل کی دوستی اور باہمی تعلقات کی قلعی کھل جاتی ہے۔ کون کس سے کتنا مخلص اور کون کس سے بے غرض تعلق رکھتا ہے یہ سب کچھ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست سے ایفائے عہد اور دلی محبت کے بلند بانگ دعوے کرتا رہتا ہے، مگر یہ سب کچھ اُس وقت تک ہوتا ہے، جب اُسے دوسرے انسان سے بدستور فائدہ ملتا ہے۔ ایسے عالم میں اُسے اپنے دوست کے عیب بھی ہنر نظر آتے ہیں، ہر محفل اور ہر انسان کے سامنے اُس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے میں مصروف نظر آتا ہے۔ عیوب پر مطلع ہونے کے باوجود معاشرہ میں اُسے بے عیب ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں شب وروز اُس کے ساتھ رہتا ہوں خدا گواہ میں نے اُس میں کسی قسم کا کوئی عیب نہیں دیکھا لوگ جھوٹ بولتے اور اُس کی خداداد عزت سے جلتے ہیں۔ میرا دوست تو

لاکھوں میں ایک ہے، وہ عالی انسانوں کے جملہ اوصاف وکمالات کا مالک ہے۔ سخاوت اور دریا دلی میں حاتم طائی سے بھی چار ہاتھ آگے ہے، علم وفضل میں رازی وغزالیِ وقت ہے۔ نظم ونثر کی دنیا میں جامی وسعدی اور علامہ اقبال کی قابلیت کا حامل ہے، خطابت میں عرب کے مشہور خطیب سحبان کی فصاحت وبلاغت اور جادو بیانی کا امین ہے، کون سا فن ہے، کون سا علم ہے اور کون سی خوبی ہے جو میرے فلاں دوست میں نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے وہی دوست اُس کی امیدوں پر پورا اترنا ترک کردے، مالی تعاون چھوڑ دے، ذرا بے رخی برتنے لگے، اُسی دوست کی دنیوی ضروریات کو پورا کرنے سے معذرت کرلے، یا کچھ کہے بغیر دینے دلانے سے ہاتھ روک لے۔ بس پھر سنیے کہ وہی ہر جگہ تعریفوں کے پل باندھنے والا دوست اپنے اُسی دوست کا کیا حشر کرتا ہے اور اُس کی عزت کو کیسے کیسے بھونڈے طریقوں سے خاک میں ملانے کے درپے ہوتا ہے۔ پھر لوگوں میں آہستہ آہستہ یہ کہنا شروع کردے گا کہ میں کل تک اُس کی تعریفوں پر تعریفیں ضرور کرتا تھا۔ صرف ایک دوست سمجھ کر، مگر اُس کے سارے عیوب اور خامیاں میری نظر میں تھیں، بس دوستی یاری کے تحت اُس کی خامیوں پر پردہ ڈالے رکھا۔ آج میں آپ سب پر حقیقتِ حال واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اُس میں پانچوں شرعی عیب موجود ہیں، انتہائی بدکار، جاہلِ زمانہ، کمینگی کی حد تک کنجوس، یاوہ گو، نظم ونثر کہنا لکھنا تو درکنار اِن الفاظ کے معانی تک سے ناواقف، اول فول بکنے والا نام نہاد خطیب، قرآن وسنّت سے بے خبر، بدمزاج، بداخلاق، متکبر اور پھر انتہائی کمینہ فطرت انسان نما جانور ہے۔ آپ نے محسوس کیا کہ کچھ پہلے اُس انسان کو مفادات ملنے کے سبب ساتویں آسمان کی بلندی پر پہنچادیا اور جب دیکھا کہ اب اُس نے فائدہ دینا ترک کردیا، یا وہ اِس کے قابل نہیں رہا تو اُسی انسان کو آناً فاناً ذلّت کے گڑھوں میں کس بے دردی سے دھکیل دیا گیا۔ یہ ہے آج کل کی دوستی اور یاری کا آنکھوں دیکھا حال۔ رشتہ داروں کے رشتے ہوں، دوستوں کی دوستی ہو یا پبلک ڈیلنگ یعنی عوامی رابطہ۔ اِن سب میں مالی تعاون اور دوسرے کے لیے قربانی دینا، تعلقات کی بحالی اور ایک قابلِ تعریف انسان کہلانے کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر دوستوں، رشتہ داروں اور عوام کو کسی قسم کا آپ

فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو آپ سب کچھ ہونے کے باوجود تنکے کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

انسان کا انسان سے یہ غرض مندانہ سلوک آج کا نہیں اور صرف عام انسان ہی سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی ہے اور اُس کے رسولوں سے بھی۔ قرآنِ مجید سے اِس کی بہت سی مثالیں بہ طورِ ثبوت پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً سورۂ یونس میں جناب موسیٰ وہارون علیہما السلام نے فرعون اور اُس کی قوم کے متموّل سرداروں کے لیے دعائے ضرر دیتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی تھی:

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنيا ، رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِم وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوبِهِم فَلَا يُؤْمِنُوا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَ لِيمo

موسیٰ نے کہا کہ ہمارے رب! تو نے فرعون اور اُس کے سرداروں کو دُنیا کی زندگی، شان وشوکت اور مال ودولت کی فراوانی عطا کی ہے کیا یہ سب کچھ انھیں اِس لیے دیا تاکہ تیری مخلوق کو تیری طرف آنے سے روک لیں، اے ہمارے رب اِن سے اِن کے مال اور شان وشوکت چھین لے اور اِن کے دلوں میں اپنی نافرمانی کی مہر ثبت فرما، یہ تیرا دردناک عذاب دیکھے بغیر تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کی اِس دعا والتجا کا مقصد یہ تھا کہ انسان فطری طور پر مال ودولت کا حریص واقع ہوا ہے، غربت اور غریبوں سے کوسوں دُور بھاگتا ہے، ہمیں نبوّت کا منصب تو ملا مگر وہ چیز نہیں دی گئی جس کی طرف انسان دوڑ کر جاتا ہے، یعنی دولتِ دنیا۔ اے اللہ! تو نے شان وشوکتِ ظاہری اور مال ومتاع سے اپنے دشمن فرعون اور اُس کے سرداروں کو نواز دیا، لوگ اُدھر جائیں گے یا ہماری بے سروسامانی کی طرف آئیں گے۔

یہ لوگ نبوّت کے فقرِ اختیاری کے مرتبۂ بلند سے ناآشنا ہیں، یہ روپے پیسے کی ریل پیل پر جان دینے والے حریص اور پست ذہن لوگ ہیں۔ اب اگر تو نے اپنی ذات اور ہماری رسالت کو ان کے سامنے منوانا ہے تو پھر فرعون اور اُس کی قوم کے جملہ سرداروں سے اُن کی یہ ساری شان وشوکت اور

مال وزر کی فراوانی چھین لے، یہ سب کچھ چھین لینے کے بعد انھیں توفیقِ توبہ وانابت بھی نہ دے بلکہ اُن کی اِسی نافرمانی کے عالم میں اُن پر اپنا عذابِ الیم بھیج، جب یہ کم بخت کہیں، تیری وحدانیت اور ہم دونوں کی نبوّت کا اقرار کریں گے۔

اگر دولتِ دنیا کی چمک دمک چشمِ انسان کو خیرہ نہ کرسکتی تو جنابِ موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے بہ طورِ خاص اللہ کی بارگاہ میں مذکورہ بالا دعائے ضرر کیوں کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اِس پورے واقعہ کو اپنی آخری کتاب میں بہ طورِ خاص کیوں ذکر فرمایا؟ بات اہم تھی تو اُسے ذکر فرمایا۔

اِسی طرح مشرکینِ مکّہ نے نبوّت کے لیے دنیوی مال ومتاع اور ظاہری جاہ وجلال کو معیار بناتے ہوئے کہا تھا:

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ یہ کیسا رسول ہے جو (ہماری طرح) کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا اِس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا جاتا تاکہ وہ بھی اِس کے ساتھ ڈرانے والا بن جاتا، یا اِس کے پاس کوئی خزانہ ہی ڈال دیا جاتا یا اِس کا کوئی باغ ہی ہوتا جس میں سے یہ کھاتا اور اِن ظالموں نے کہا کہ تم تو ایسے آدمی کے پیچھے چل رہے ہو جس پر جادو کردیا گیا ہے۔

اِن آیات میں بیان کردہ مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین کے نزدیک عامیانہ زندگی گزارنے والا انسان منصبِ نبوّت کا اہل نہیں ہوسکتا، ایسے انسان کو عام انسانوں کی طرح کھانا پینا اور بازاروں سے سودا سلف بھی نہیں لانا چاہیئے، اُسے خزانوں کا مالک بھی ہونا چاہیئے اور اُس کے پاس باغات اور زرعی زمین بھی ہونا ضروری ہے۔

مشرکین کا یہ وہ عامیانہ سا معیار تھا، جسے تقریباً ہر دور کے انسان نے اپنائے رکھا اور آج ہمارے دَور کے انسانوں کا بھی یہی معیار ہے اور ہم بھی اپنے اِس مضمون میں یہی ثابت کرنا

چاہتے ہیں کہ انسان کی بہ حیثیتِ انسان بہت کم قدر کی جاتی ہے، اُس کی ظاہری شان وشوکت اور مال ودولت کی بنا پر اُسے زیادہ عزت دی جاتی ہے۔

اگر ہم ان بیان کردہ مطالب کی روشنی میں مقامِ صحابہٴ کرام دیکھنا چاہیں، تو اُن کی عظمتیں کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ جس رسول کی غربت وافلاس کو مشرکینِ مکّہ نے اُس کے نبی نہ ہونے پر بہ طورِ حجت پیش کیا، صحابہٴ کرام کے طبقۂ عالیہ نے اُسی رسول کے کچے حجروں کے سامنے اپنی آنکھیں بچھادیں، اپنے گھر بار اور وطن کو خیرباد کہا، گھر کی سہولت کو چھوڑا، سیر شکمی پر بھوک اور پیاس کو ترجیح دی، توحید ورسالت کی منزل تک پہنچنے کے لیے اِس طویل راستے کی ہر دشواری اور سختی کو خندہ پیشانی سے قبول کیا، اپنے اُس محبوب رسول کی ہر دعوتِ جہاد پر صدائے لبیک بلند کی، یہ وہ رسول تھے جن کے ہاں قیام وطعام کا کوئی بندوبست نہ تھا، بلکہ آپ خود بھی کئی کئی دن فقر وفاقہ میں بسر فرماتے تھے۔ یہ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے آخر صحابہٴ کرام نے اپنے ارادے عمر بھر کیوں نہ بدلے اور اُسی چوکھٹ پر اپنا سرِ نیاز رکھ کر کیوں کہتے رہے۔

جبیں کو در پہ ترے رکھ دیا یہی کہہ کر
یہ جانے اور ترا سنگِ آستاں جانے

اِن باتوں سے مقامِ صحابہٴ کرام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مگر اِس کے لیے بھی انسان کا منصف مزاج اور صحیح العقل ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اہلِ بیتِ عظام اور صحابہٴ کرام کا ادب واحترام بجالانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا ممنوع نہیں، بلکہ اُن کی محبت کو اللہ ورسول کی محبت واطاعت پر ترجیح دیتے ہوئے، مالکِ حقیقی کو فراموش کردینا بے دینی ہے۔ ترکِ دنیا رہبانیت ہے، جو اسلام میں روا نہیں، میانہ روی کو اپنانا، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینا، اللہ ورسول کے احکام کی حتی الوسع پابندی کرنا، دنیوی امور سرانجام دینے کے باوجود اپنے خالق کی یاد سے دل کو آباد رکھنا، اہلِ ایمان کا شیوہ ہے۔

ترکِ دنیا سے دنیا کو ترک نہیں کیا جاسکتا، بلکہ جو شخص دنیا کے معاملات میں مشغول رہتے ہوئے یادِ خالق سے وابستہ رہے، اُس کو صوفیاء دنیاداروں میں شامل نہیں کرتے۔ کیوں کہ وہ یادِ حق سے غافل نہیں۔ اکبر مرحوم نے اِس سلسلے میں خوب کہا تھا ۔

اُسے ہم آخرت کہتے ہیں جو مشغولِ حق رکھے
خدا سے جو کرے غافل اُسے دنیا سمجھتے ہیں

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دنیا کو اللہ نے ہمارے لیے پیدا فرمایا نہ کہ ہمیں دنیا کے لیے پیدا کیا۔ دنیا کی طلب میں اس قدر محو ہو جانا بھی کوئی اچھی بات نہیں کہ انسان موت اور آخرت کو بھول ہی جائے۔ قرآنِ مجید نے مال و اقتدار کے حوالے سے قومِ عاد و ثمود کا بہ طورِ خاص اِسی لیے ذکر فرمایا تا کہ اُن کے بعد آنے والے انسانوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ آج اگر تم مال و اقتدار پر اِترا رہے ہو تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، ہم نے تم سے پہلی اقوام کو سلطنت، اقتدار اور مال کا مالک بنایا ہے، جو تم سے بہت آگے تھے۔ تم اُن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ مگر جب اُنہوں نے بے اعتدالیاں دکھائیں، خلقِ خدا پر ظلم و ستم کا دروازہ کھولا، ازراہِ تکبر زمین میں اپنی گردن بلند کی، ہمیں اور ہمارے رسولوں کے پیغامات کو جھٹلایا۔ مال و اقتدار کو دائمی سمجھا، موت کو بھلادیا، ہماری گرفت سے بے خوف ہوئے، زمین میں ہر طرح کا فساد پھیلانے لگے، ملک گیری کی ہوس میں بے گناہ مخلوق کا قتلِ عام کرنے لگے تو پھر فَصَبَّ عَلَيۡهِمۡ رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ. تیرے رب نے اُن پر عذاب کے کوڑے برسائے۔ اور اُن کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔

نمرود نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت حتیٰ کہ وجودِ باری تعالیٰ سے بھی انکار کر دیا اور خود کو رب کہلوا کر رعایا سے اپنی پوجا کراتا رہا اُس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ اُس کا دولتمند اور صاحبِ اقتدار ہونا تھا اگر اُس کے قابو میں دولت و اقتدار کا جن نہ ہوتا تو شاید وہ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کی جسارت بھی نہ کرتا۔ خود قرآنِ مجید نے اُس کے اِس تمرّد و تکبر کی وجہ بھی قرار دیتے ہوئے فرمایا: اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِیۡ رَبِّهٖۤ اَنۡ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ ۔ ”کیا تو نے اُسے نہیں دیکھا

جو سلطنت پا کر ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا۔ یہی سلطنت و دولت اُس کے خدائی دعویٰ کا سبب بنی لیکن اللہ تعالیٰ نے اُس کے غرور اور خدائی دعوے اِس طرح توڑے کہ اُسے ایک مچھر کے ہاتھوں تباہ و برباد کرا دیا“۔

سورۂ قصص میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کے لیے اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ کے الفاظ استعمال فرمائے کہ فرعون نے یقیناً زمین میں اپنی گردن اکڑائی یا اپنے آپ کو بڑا سمجھا۔ لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا، ایک گروہ کو معاشی اعتبار سے آسودہ اور طاقت ور بنایا اور دوسرے گروہ کو کمزور اور مفلوک الحال کر دیا پھر فرمایا، اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ کہ یقیناً فرعون فساد بپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب فرعون کی اِس طاغوتی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ نے اُس قوم سے ایک انسان کو منتخب فرمایا جسے فرعون نے ہر اعتبار سے کمزور اور ضعیف کر دیا تھا۔

چنانچہ ارشاد ہوا: وَنُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّ نَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ اور ہم نے ارادہ کیا کہ جن کو زمین میں کمزور کر دیا گیا، اُن میں سے رہنما بنائیں اور اُنہی میں سے زمین کے وارث بنائیں (صرف وارث اور رہنما ہی نہ بنائیں بلکہ) وَنُمَكِّنَ لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَنُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ اُنہیں زمین میں تسلط و اختیار بھی دیں اور فرعون ہامان اور اُن کے ہمنواؤں کو وہ مناظر دکھائیں جنہیں وہ دیکھنا ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے۔

اِن آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک طاقت و ناطاقتی کوئی چیز نہیں، وہ طاقت کو ناطاقتی اور ناطاقتی کو طاقت میں بدلنے پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے۔ اور یہ کہ جب وہ چاہے تو ایک بے طاقت انسان کو دنیا کے عظیم طاقت ور سے مقابلہ میں لا کھڑا کر سکتا ہے اور پھر اُس کی طاقت کو ایک بے طاقت انسان کی بے طاقتی کے ہاتھوں روند کر رکھ دیتا ہے۔ کمزور کو طاقت ور بنانا اور طاقت ور کو خس و خاشاک کی طرح بے طاقت کر دینا اُس کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، سیدنا موسیٰ کمزور گروہ میں سے تھے، اللہ تعالیٰ اُنہیں نبوت کی طاقت سے سرفراز فرما کر فرعون کی طاغوتی طاقت

کے سامنے لے آیا۔ اور پھر فرعون کو وہ مناظر دکھائے جو وہ کسی طرح بھی دیکھنے کے حق میں نہ تھا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کا اقتدار۔ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے کسی مخالف کا اقتدار اور عزت نہ دیکھنا چاہتا ہو اور اُسے وہ سب کچھ بادلِ ناخواستہ دیکھنا پڑے تو اُس کے لیے یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک عذاب کی صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ انسان کے لیے اس سے بڑا کوئی عذاب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف کو جس بہتر حالت میں نہ دیکھنا چاہتا ہو، اُسے دیکھنا پڑے۔ فرعون نے تو اپنی طاقت صَرف کر کے موسیٰ علیہ السلام کو ہر اعتبار سے کمزور وضعیف کر دیا تھا، اب اُس کو یقین تھا کہ میری طاقت نے موسیٰ کے گروہ کو اتنی بری طرح سے کچل دیا کہ وہ عمر بھر سر اُٹھا نہیں سکے گا۔ مگر اللہ نے یہ بتا دیا کہ تم جس دولت واقتدار پر گھمنڈ کر رہے ہو وہ میرے اشارۂ قدرت کے غلام ہیں، میں جس سے چھین کر جسے دے دوں یہ میری مرضی ہے۔ اگر میں یَا نَارُ کُوْنِی بَرْداً وَّ سَلَاماً عَلٰیٓ اِبْرَاھِیْمَ کہہ کر آگ کی فطری حدّت کو برودت میں بدل سکتا ہوں تو تمہاری طاقت کو ناطاقتی میں تبدیل کیوں نہیں کر سکتا۔ جناب موسیٰ اور فرعون کے اِس واقعہ سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مال و دولت اور اقتدارِ دنیا کی کوئی حیثیت نہیں، جب تک اِن سے کسی کو سرفراز رکھنا چاہے یہ اُس کی مرضی، نہ چاہے تو کسی کا اقتدار اور مال و دولت کسی بھی وقت کسی سے بھی چھین کر کسی کو بھی دے سکتا ہے اور یہ قدرتِ کاملہ اُسی کا خاصہ ہے، جو اِس پوری کائنات کا متصرّف اور مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ جس کو دینا چاہے، اُسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس پر روک دے اُسے کوئی دے نہیں سکتا۔ مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَھَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ کی آیتِ کریمہ ہمارے اِس دعوٰی پر شاہدِ ناطق ہے۔

دنیا کی دولت اور اقتدار کی دعا اِس نیّت کے ساتھ ممنوع نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا اجرا کیا جائے گا، اُس کی وحدانیت اور اُس کی بھیجی ہوئی ہدایت کو ملک کے اندر نافذ کیا جائے گا۔ اگر یہ عمل ممنوع ہوتا تو حضرت سلیمانؑ بارگاہِ الٰہیہ میں عطائے سلطنت کی دعا ان الفاظ میں نہ کرتے۔

رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکاً لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ، "اے میرے مالک،

مجھے ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کو میسّر نہ آسکے یقیناً تو ہی عطا کرنے والا ہے"۔ اِس دعا سے دل میں یہ وہم نہ پیدا ہو کہ معاذ اللہ پیغمبر بھی عام لوگوں کی طرح دنیا کے حریص ہوتے ہیں۔ بلکہ اِس دعا کا مقصد یہ تھا کہ تیرے عطا کردہ اقتدار اور دولت کو تیرے دین کی تبلیغ کے لیے صرف کروں گا کیوں کہ ایسی صورت میں اشاعت وتبلیغ کے لیے مشکلات بہت کم ہوتی ہیں، منصبِ نبوّت خود ایک ایسی عظیم دولت ہے کہ دنیا کے یہ عارضی اقتدار اور مالداری اُس کے سامنے خاک کے برابر بھی نہیں۔ لیکن اگر ایک نبی کو منصبِ نبوت کے ساتھ اقتدارِ دنیا اور دولت وحشمتِ ظاہری بھی حاصل ہو جائے تو یہ سونے پہ سہاگے کا کام کرتی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جس نبیؑ اور جس صالح انسان کو اللہ تعالیٰ نے روحانی مقام کے ساتھ اقتدارِ ظاہری عطا فرمایا اور مال و دولت کی فراوانی سے بھی نوازا تو اُنھوں نے بتائیدِ ایزدی انسانی معاشرہ کو امن وآشتی کا گہوارہ بنانے کے ساتھ اُسے اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند اور قائل بھی کیا۔ معلوم ہوا کہ جو دل اللہ کی یاد سے آباد ہو، مال و دولت کی محبت اُسے برباد نہیں کر سکتی ہے اور نہ اپنے دام میں پھنسا سکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام واہلِ بیت کا مقام تو بہت بلند ہے۔ اُمّت کے صالحین کے قلوب بھی اِس کی محبت سے پاک ہو جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے جدِّ امجد حضرت بابو جیؒ فقراء ومساکین میں خطیر رقم تقسیم کر رہے تھے۔ خدام نے روپوں کی تھیلیاں کندھوں پر اُٹھا رکھی تھیں۔ تقسیم کے دوران اپنے ایک خاص خادم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے یہ دیکھو میرے ہاتھ روپے تقسیم کرنے کے سبب کالے ہو گئے یعنی اِن پر روپوں کی میل چڑھ گئی۔ جس طرح ہاتھ اِن سے میلے اور کالے ہو جاتے ہیں اگر انسان اِن کی محبت دل میں ڈال لے تو اُس کا دل بھی ہاتھوں کی طرح میلا اور کالا ہو جاتا ہے، لہٰذا دولت سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی حد تک واسطہ رکھنا چاہیے اگر اِس سے محبت کی جانے لگے تو انسان کا دل حبِّ دنیا کے سبب سیاہ ہو جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اُن کی اِس مختصر سی بات میں کتنا عظیم درس پوشیدہ ہے۔ صوفیاء نے اپنے بعض اشعار میں دولتِ دنیا سے محبت کرنے کی شدید مذمت فرمائی ہے،

ایک صوفی کے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ غریب انسان مرتے وقت بہ آسانی مرجاتا ہے، کیوں کہ اُسے معلوم ہے کہ میں نے کچھ چھوڑا نہیں، جس کا مجھے غم ہو۔ مگر ایک امیر انسان کے لیے مرنا دشوار ہوجاتا ہے، وہ موت کی سختی سے کم اور دولت چھوڑنے کے غم میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے۔ گویا وہ اِس طرح دوہرے غم کا شکار ہوتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اپنے ایک مصرع میں کتنی جامع بات کہہ دی ہے ؎

آناں کہ غنی ترانند محتاج ترانند

وہ لوگ جو زیادہ مالدار ہیں، عوام کی نسبت وہ ہر بات میں زیادہ محتاج ہوتے ہیں۔ جو خوش نصیب فقرِ محمدی کی دولت سے مالا مال ہوں، کچھ نہ ہونے پر بھی وہ غنائے نفس کے مالک ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: الغناء غنا النفس ”نفس کی غنا اور اصل غنا ہے“۔ انسان اگر بے سروسامان ہوتے ہوئے بھی مستغنی رہے تو وہ مفلس نہیں بلکہ غنی ہے۔ صحابۂ کرام، اہلِ بیتِ عظام اور اولیائے اُمت اِسی فقر کے وارث تھے۔ یہ ایسا فقرِ غیور تھا کہ اِس کے افلاس پر قیصر وکسریٰ کی شہنشاہی رشک کرتی تھی۔ فاروقِ اعظم اپنے سر کے نیچے اینٹ کا تکیہ رکھ کر آرام فرماتے تھے، قاقم وسنجاب کے بستر کے بجائے بوریا پر لیٹتے تھے، مگر رعب کا یہ عالم ہوتا کہ بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک اُن کے نام سے کانپ اُٹھتے تھے۔ یہ وہی فقر تھا، جو آپ کو سرکارِ ختمی مرتبتؐ کی بارگاہ سے حاصل ہوا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں جابجا اِسی فقر کی تعریف کی اور اِسے خودی کے مفہوم سے تعبیر کیا گویا خودی سے، جو درحقیقت خود آشنائی ہے، اِس فقر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اپنی ذات کا عرفان ہی خودی اور فقر کی اساس ہے۔

قرآنِ مجید میں دنیا اور اُس کی حیات کو لہو ولعب سے تعبیر کیا گیا، اگر انسان ذرا غور سے کام لے تو حقیقت میں دنیا اور اُس کی زندگی اُس کے لیے لہو ولعب، زینت، تفاخر اور مال واولاد میں جذبۂ تکاثر کے سوا کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ دانا انسان کے نزدیک لہو ولعب اور زینت وتفاخر ایک تماشا کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے، تماشے کو نادان انسان تو شاید حقیقت سمجھ بیٹھے مگر دانا اور علم وفہم رکھنے والا تماشے کو تماشا ہی سمجھتا ہے۔ اسی لیے بیخود دہلویؒ نے، جو صوفیانہ ذہن کے مالک تھے، دنیا کو ایک تماشا خانے

سے تعبیر کرتے ہوئے کیا خوب شعر کہا تھا ؎

جو تماشا نظر آیا اُسے دیکھا سمجھا جب سمجھ آگئی ، دنیا کو تماشا سمجھا

اسی مفہوم کو غالبؔ مرحوم نے اپنے ایک شعر میں یوں باندھا ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مردانِ خدا کے نزدیک دنیا کے سازوسامان اور مال ودولت پر اترانے اور خوش ہونے والے طفلانہ مزاج کے مالک ہیں، اگر اُن کا ذہن پختہ ہوتا تو دنیا اور اُس کے اسباب سے کبھی دل نہ لگاتے۔ سلطان الواصلین حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ نے کیا خوب رباعی فرمائی ہے، ملاحظہ فرمائیں ؎

مردانِ خدا میل بہ ہستی نہ کنند
خود بینی و خویشتن پرستی نہ کنند
آنجا کہ مجردانِ حق مے نوشند
خمخانہ تہی کنند و مستی نہ کنند

راقم الحروف نے آپ کی مندرجہ بالا رباعی کا اردو قطعہ میں یوں ترجمہ کیا ؎

مردانِ خدا رغبتِ ہستی نہیں کرتے
یہ لوگ کبھی نفس پرستی نہیں کرتے
پیتے ہیں جہاں اہلِ صفا بادۂ عرفاں
میخانہ بھی پی جائیں تو مستی نہیں کرتے

حرصِ دنیا اور محبتِ مالِ دنیاداروں کے دل سخت کردیتی ہے، بخل وامساک کا زنگ اُن کے آئینۂ دل کو سیاہ کردیتا ہے، حاجت مند کی احتیاج سے وہ متأثر نہیں ہوتے، جب تک انقلابِ زمانہ اُن کو نکبت وافلاس سے دوچار نہ کرے اور وہ عیش وعشرت کی زندگی سے محروم ہوکر تنگیٔ معاش کے مناظر نہ دیکھیں۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ جو ایک عظیم صوفی شاعر ہونے کے ساتھ دردمند دل کے

مالک بھی تھے، اپنے ایک شعر میں اس مفہوم کو مثال دے کر سمجھاتے ہیں ۔

بے معصیت گریہ بر طبعِ درشت سود نیست — سنگ در آتش فگن تا آبش آساں بشکند

کسی سخت طبیعت انسان کے سامنے زار و زار رونا دھونا کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتا، تا آں کہ وہ خود کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو۔ یعنی اُس سخت دل انسان پر جب تک مصیبت و آفت نہیں آئے گی، اُس کے سامنے تیری گریہ وزاری بے فائدہ رہے گی، ہاں اگر اُس کی اپنی ذات پر کوئی آفتِ ناگہانی آپڑی تو پھر تیری فریاد اُس پر اثر کر سکتی ہے۔

بیدلؔ اپنے اس دعوٰی کو ایک ایسی مثال دے کر سمجھاتے ہیں، جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ویسے کسی ٹھوس پتھر پر کتنا ہی پانی ڈالتے جاؤ اُس پر کوئی اثر نہیں ڈالے گا بلکہ فترکہ صلدا کے مطابق اور خواجہ حافظ شیرازیؒ کے مصرعہ "بر سنگِ خارہ قطرۂ باراں اثر نہ کرد" کے تحت پانی بہہ کر نکل جائے گا اور وہ پتھر اپنی فطری سختی کے سبب اپنے اندر پانی کا ذرہ برابر اثر نہیں لے گا، مگر جب اُسی پتھر کو تم آگ میں ڈال دو، تو آگ کی مصیبت اُس کی اُس فطری سختی کو خاک بنا دے گی، اِس مرحلہ سے گزارنے کے بعد جب تم اُس پر وہی پانی ڈالو گے جو پہلے اُس پر اثر نہیں کرتا تھا، اب وہی سخت پتھر جو آگ میں پڑنے کی مصیبت سے گزر چکا ہے اور اندر سے ٹوٹ چکا ہے فوراً پانی کو اپنے اندر جذب کرنے لگے گا اور اس کے نتیجے میں ٹوٹ جائے گا چونہ بنانے کی بھٹیوں میں پتھر کو جلایا جاتا ہے، جب آگ پتھر کی خاصیت کو جلا کر مٹی بنا دیتی ہے تو وہ پتھر پتھر نہیں بلکہ چونہ بن جاتا ہے اور اُس پر پانی ڈالنے سے بھاپ نکلتی ہے کیوں کہ اُس کا اندر جلا ہوا ہوتا ہے اِس لیے تھوڑا سا پانی بھی اُس کو توڑ دیتا ہے۔ اِس مثال سے سمجھ میں آیا کہ جس طرح پتھر کے توڑنے کے لیے اُس کو آگ میں ڈالنا ضروری ہے تاکہ اُس کی فطری سختی میں تبدیلی واقع ہو اور وہ کسی دوسری سیال چیز کا اثر قبول کرے، اِسی طرح حرصِ دنیا کے ہاتھوں سخت دل انسان کا مصیبت میں گرفتار ہونا ضروری ہوتا ہے، جب کسی ناگہانی آفت کے سبب اُس کا اندر ٹوٹے گا تو کسی بھی حاجت مند کے آنسو اُس کے دل نرم پر گہرا اثر چھوڑ سکیں گے، ورنہ مصیبت پڑنے کے بغیر دنیا دار انسان کا دل سختی

میں اُس پتھر کی طرح سمجھو، جو ابھی آگ کی بھٹی کے امتحان سے بچا ہوا ہے ۔ بیدلؔ کی اس خوبصورت مثال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آفات کا نزول قلبِ انسانی کو موم کرنے کے لیے تریاق کا کام دیتا ہے اور یہ کہ دنیا داروں کی نسبت اللہ والوں کے قلوب، قدرت کے امتحانات و آفات کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ اِس لیے اہلِ معرفت کے دل دنیا داروں کی نسبت دُکھی انسانیت کے لیے نہایت نرم اور دردمند ہوتے ہیں۔

روایات میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے پاس ایک شخص آیا اور اپنے حالات کی ابتری پر زارو قطار رونے لگا، کچھ دیر بعد حضرت شہاب الدینؒ رونے لگے اور وہ ہنسنے لگا۔ بعد میں لوگوں نے اُس سے اس کی وجہ دریافت کی تو اُس آدمی نے کہا کہ میں حالات کی تنگی کے ہاتھوں اپنے پیر کے سامنے رویا تھا، جب میں نے دیکھا کہ میرا رونا دیکھ کر میرا پیر رونے لگ گیا اور اُس نے میرے تمام غم اپنے سر لے لیے تو اب مجھے رونے سے کیا فائدہ۔ پیر جانے، میرے غم جانیں اور پیر کا اللہ جانے۔

حضرت شہاب الدینؒ نے اُس آنے والے کے غم کو کیوں اپنا غم سمجھ لیا اور اُس کے رونے سے اس قدر متاثر کیوں ہوئے کہ خود رونے بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ ترکِ حرص، دنیا و مافیہا سے بے نیازی، خلقِ خدا سے ہمدردی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے امتحانات، آفات اور بلیات کے سبب دل کی وہ نرمی اور وہ گداز تھا، جو اللہ کا مقبول طبقہ ایک طویل عرصہ تک ان صبر آزما مراحل سے گزر کر حاصل کرتا ہے۔ اور امیرؔ مینائی کے درج ذیل شعر کا منہ بولتا ثبوت بن کر سامنے آتا ہے ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

صوفیاء کی دردمندی، آہ وزاری، غمگینی، شفقت علی الخلق اور غریب نوازی کے دیگر اسباب میں سے ایک سب سے بڑا سبب یہ بھی ہے کہ قادرِ مطلق نے انہیں مختلف ذرائع سے دردمندیِ دل کی دولت عطا فرمائی، اُن کا وجد وحال، آہ و بکا، اشک باری، دنیا سے بے رغبتی، فقر آشنائی اسی داخلی لگن

اور درد وسوز کے غماز ہیں۔ بلاشبہ انسان کے لیے یہ ساری چیزیں خالق کا ایک بیش بہا عطیہ ہیں۔
صوفیائے کرام کے سلسلے میں اکثر پوچھا جاتا ہے کہ یہ طبقہ عوام کے احساسات کے زیادہ قریب کیوں ہوتا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ عوام چوں کہ مختلف مصائب وشدائد کی زد میں رہنے کے باعث اکثر غمگین اور پریشان رہتے ہیں اور صوفیاء درد وسوز کی دولت سے پہلے ہی مالا مال ہوتے ہیں، اس لیے عوام کے درد وغم میں شریک ہوتے ہیں۔ نتیجۃً عوام کا مرجع قرار پاتے ہیں۔ نظیری نیشاپوریؒ نے اپنے ایک شعر میں ایک درد مند انسان کے دوسرے درد مند انسان سے قلبی رابطے اور قرب کو ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

محبت با دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

غمگین دل انسان کے ساتھ ایک درد مند انسان کا میلان قدرتی امر ہے، یعنی وہ اُس سے زیادہ مانوس ہو جاتا ہے ایسا چراغ جس کی بتی میں پہلے سے دھواں موجود ہو، وہ آگ کو فوراً پکڑ لیتا ہے۔ اِسی طرح ایک غمگین دوسرے غمگین سے عیش پسند لوگوں کی نسبت زیادہ مانوس ہوتا ہے، کیوں کہ کیفیتِ غم دونوں میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہوتی ہے، جس طرح وہ چراغ جو تازہ تازہ بجھا ہو اور اُس میں دھواں ابھی موجود ہو، وہ دوسرے چراغوں کی نسبت آگ سے زیادہ قریب اور اُس سے زیادہ مانوس ہوتا ہے، اُسے آگ کا ہلکا سا اشارہ بھی جلانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ نظیریؔ کی اِس خوبصورت اور عام تجربہ میں آنے والی مثال نے ایک درد مند کے دوسرے درد مند انسان سے مانوس ہونے کا معمہ کھول دیا اور ہمیں سمجھ آ گئی کہ وہ دل جن میں دولتِ درد وسوز موجود ہوتی ہے، وہ دُکھی انسانیت کا درد بانٹنے اور اُن کے غم میں شریک ہونے کو اپنا فریضۂ منصبی خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبولین اور بندگانِ خاص دنیا داروں سرمایہ داروں اور اسیرانِ حرص وہوا کی نسبت اہلِ درد فقراء ومساکین کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں یہی فرمایا ہے کہ اگر تم حقیقتِ حال سے باخبر ہو تو زیادہ رویا اور کم ہنسا کرو اِس آیت میں ہنسنے پر رونے کو ترجیح

دی گئی) حضور سیدِ عالم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا کہ جو حقائق میں دیکھتا اور جانتا ہوں اگر تم بھی جانتے تو زیادہ روتے اور کم ہنستے۔ اِسی لیے خود حضور ﷺ بھی اکثر مغموم نظر آتے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اہلِ نشاط سے اہلِ غم کا مرتبہ زیادہ ہے۔ اِسی بنا پر انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین جن میں صحابہ، اہلِ بیت اور قیامت تک آنے والے اولیاء وصالحین شامل ہیں، نے اہلِ دولت وثروت کے بجائے مفلوک الحال غرباء وفقراء ومساکین اور درد وسوز رکھنے والے انسان کو اپنا قرب عطا فرمایا اور اُن کی قدر افزائی فرمائی۔ سیّدنا ابوھریرہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت خبابؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر، حضرت سلمانؓ اور دیگر فقرائے مہاجرین کے بارے میں حضور سیدِ عالم ﷺ نے جو فضیلت کے الفاظ فرمائے اور آپ جس قدر اِن حضرات کو محترم ومعزز سمجھتے تھے وہ اہلِ علم پر پوشیدہ نہیں۔ روایاتِ معتبرہ میں آتا ہے کہ ایک دن حضور ﷺ کی مجلس میں فقرائے مومنین، صہیبؓ، بلالؓ، عمارؓ، سلمان فارسیؓ اور خبابؓ بیٹھے ہوئے تھے اِتنے میں قریش کے سردار آ گئے، جب اُنہوں نے اِن سب کو آپ کی مجلس میں بیٹھے دیکھا تو حضورؐ سے کہنے لگے کہ اگر آپ اِن گھٹیا لوگوں کو جنہوں نے میلا اور کم تر لباس پہنا ہوا ہے اپنی مجلس سے اُٹھا دیں تو ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں گے اور آپ سے بات بھی کریں گے۔ حضور ﷺ نے جواباً فرمایا کہ میں ایمان والوں کو اپنے پاس سے اٹھانے کے حق میں نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ پھر کم از کم اِن کو اُس وقت اپنی مجلس سے اُٹھا دیا کریں، جب ہم آپ کے پاس آنا چاہیں، تا کہ عرب پر ہماری فضیلت واضح ہو سکے، کیوں کہ عرب کے وفود آپ کے پاس آتے ہیں تو (معاذ اللہ) ایسے گھٹیا لوگوں کو آپ کے پاس بیٹھا دیکھ کر آپ کے پاس آنے سے عار محسوس کرتے ہیں، جب ہم آپ کی مجلس سے اُٹھ کر چلے جائیں تو اُس کے بعد اگر اِن لوگوں کو آپ اپنے پاس بٹھانا چاہیں تو بٹھا لیا کریں۔ اُن کی باتیں سن کر حضور ﷺ کے دل میں ارادہ ہوا کہ آپ ایسا کر لیا کریں ہو سکتا ہے کہ آپ کے اِس عمل سے آنے والے مشرکین ایمان لے آئیں۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ولا تطرد الذین یدعون ربّھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہٗ ”آپ اُن

لوگوں کو اپنے پاس سے دور نہ کریں جو رات دن اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور محض اُس کی ذات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں"۔ صاحب روح البیان اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فقیر پر اغنیاء کو اعلیٰ خاندان والوں کو گھٹیا خاندان والوں پر ترجیح دینے کو پسند نہیں فرماتا کیوں کہ اُس کا طریقہ یہی ہے کہ جس پر اُس نے اپنے دین کو اتارا ہے، دنیا کے حالات اور اُن کی طبقاتی پستی و بلندی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

علامہ اسماعیل حقی مصری اپنی تفسیر روح البیان میں ایک مقام پر ایک روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے گرد غریب ترین صحابہ جمع تھے جن میں حضرت صہیب رومیؓ، عمارؓ بن یاسر، حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ بھی تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ دنیا کی کون سی نعمت ہے، جو اللہ نے مجھے نہیں دی، اور وہ کون سی عزت ہے جس کے بیل بوٹے میری پوشاک پر نہیں کاڑھے گئے اور کون سی بشارتیں ہیں، جو مجھے نہیں دی گئیں، کون سے اعلیٰ مناصب ہیں جن سے مجھے سرفراز نہیں کیا گیا، بخدا اگر مجھے دو چیزوں میں اختیار دیا جائے کہ تم اِن تمام نعمتوں، عزتوں اور کائنات کے اقتدار و شوکت کو پسند کرو گے یا ان فقرائے مہاجرین کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دو گے۔ تو اُس ذات کی قسم ہے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں یعنی محمد اپنے ان غریب اور مفلس صحابۂ مہاجرین کے ساتھ بیٹھنے اور ان سے اپنے مالک کی باتیں کرنے اور اُس کی حمد و ثنا بیان کرنے کو ترجیح دوں گا۔ یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد اسماعیل حقی نے درج ذیل شعر بھی نقل کیا۔

آسماں سجدہ کند پیشِ زمینے کہ بر او
یک دو کس یک دو نفس بہر خدا بنشینند

کہ جس زمین پر ایک دو آدمی ایک دو لمحوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اُس کے ذکر کے لیے بیٹھ جاتے ہیں تو آسماں اپنی اِس رفعت کے باوجود اُس زمین کو سجدہ کرتا ہے۔

ان روایات کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ حضور سیّدِ عالم ﷺ کا معمول اور آپ کی سنت مبارکہ تھی کہ آپ اہلِ دنیا پر فقراء و مساکین کو ہمیشہ ترجیح دیا کرتے تھے، ایسے فقراء جن کے دل اللہ کی یاد سے آباد

تھے، اور جو اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی کبریائی اور اُس کی محبت سے اپنے نہاں خانۂ دل کو معمور کیے ہوئے تھے۔ اگر بالخصوص آج کا مسلمان اپنے آقا و مولیٰ کے اِس طرزِ حیات اور اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھے تو اُس کا دل ہوسِ دنیا اور جمع مال سے آزاد ہو سکتا ہے۔ ایک آیت مبارکہ کی تفسیر کے تحت صاحب روح البیان تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی کی، جس میں دنیا کو مردار اور اُس کے طلب کرنے والوں اور اُس پر جھپٹنے والوں کو کتوں سے مثال دے کر آپ علیہ السلام کو اُس سے بچنے کی تاکید کی۔ یہ اسلوب متنازعہ تو نہیں؟

(روح البیان، جلد اوّل، ص 688، مطبوعہ مصر)

اگر چہ انبیاء علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ بفضلہ تعالیٰ دنیا کی ہوس سے پاک ہوتی ہیں مگر یہاں اللہ نے افرادِ اُمت کی تعلیم کے لیے اور دنیا کی ہوس سے اُنھیں نفرت دلانے کے لیے اپنے ایک اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو مخاطب فرمایا تا کہ عوام کو ہوسِ دنیا کی مذمت کا اندازہ ہو جائے کہ اگر ایک پیغمبر کو خطاب کیا جا سکتا ہے تو ہم لوگ کس کھیت کی مولی ہیں۔ لہٰذا ہمیں دنیا سے زیادہ اللہ کے ذکر اور آخرت کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اُن فقراء و مساکین اور صالحین سے رابطہ رکھنا اور اُن کو معزز سمجھنا چاہیے کہ جو دنیوی مال و دولت اور شان و شوکت سے تو محروم ہیں، لیکن اُن کے دل اللہ کی یاد سے آباد ہیں اور وہ ایسے ہیں اذا رُؤوا ذُکر اللّٰہ کہ جب اُن کے چہرے کو دیکھا جائے تو اللہ یاد آ جائے۔ بلاشبہ ایسے لوگ ہی فقرِ محمدی کے وارث ہوتے ہیں اور قرآنِ مجید اور احادیث کی زبان میں اِنھی کو اولیاء اللہ اور صالحین اُمت کہا جاتا ہے۔

انسان مذکورہ تمام حقائق سے آشنا ہونے کے باوجود آج تک بدستور مبتلائے ہوسِ دنیا ہے، اگر وہ کسی سے دوستی کا بندھن باندھتا ہے اور اُسے اپنی وفا کا یقین دلاتا ہے تو اُس کی تہہ میں حرص و ہوس موجود ہوتی ہے۔ دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اگر قریبی رشتے ہوں تو اُن سے بھی یہی سلوک حرص روا رکھتا ہے۔ انسان تو انسان اللہ اور اُس کے رسول کے ناموں کو اپنے ذاتی مفادات کی حد تک استعمال کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ اپنے بزرگوں اور روحانی شخصیات کی

دینی خدمات اور اُن کے علمی کارناموں کو عمر بھر کیش کراتا ہے۔ مذہبی عقائد کی موجودہ گروہ بندیوں سے اُس کا کوئی طبعی لگاؤ نہیں ہوتا، صرف ایک مسلک کی نمائندگی کے حوالے سے ہمسلک لوگوں کی خدمات وصول کرتا ہے۔ دوسرے مسالک کی مخالفت کا علمبردار بن کر دنیا کماتا ہے۔ غرض ہر طرح اور ہر مقام سے کچھ نہ کچھ وصولی کرلینا اُس کی فطرت میں شامل ہو گیا ہے۔ اگر انسان کی غرض مندی اور نفسانفسی کا یہی عالم رہا تو عقائدِ اسلامیہ کی دنیا تباہ ہو کر رہ جائے گی اور قرآن وسنّت میں جس قیامت کے برپا ہونے کا جابجا ذکر ملتا ہے، وہ کسی وقت بھی بپا ہو جائے گی۔ دہشت گردی اور قتل وغارت کا جو بازار آج عالمگیر حیثیت حاصل کر چکا ہے، اس کے پیچھے اِسی حرصِ دنیا اور جمعِ مال کا روگ کارفرما ہے۔ آخر ان تمام بیماریوں کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان چوں کہ ایک اسلامی مملکت ہے اور یہ مملکت قرآن وسنّت کے نفاذ کے حوالے سے معرضِ وجود میں آئی تھی، یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ اِس مملکت کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد آج تک اِس میں وہ قانون نافذ نہ ہو سکا، جس کے نام پر یہ مملکت بنی تھی۔ لہٰذا حکومتِ وقت پر بحیثیتِ مسلمان یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اِس مملکت میں فوری طور پر قرآن وسنّت کے احکام نہ صرف نافذ کرے، بلکہ اُنھیں مملکت کے قانون کا درجہ بھی دے۔ اب کسی قسم کے عذر اور بہانہ جوئی سے کام نہیں چلے گا، امریکہ ہو یا برطانیہ تمام غیر مسلم ممالک میں جب اُن کا اپنا وضع کردہ قانون چل رہا ہے اور اس پر دنیا کے کسی ملک اور اُس کے سربراہ کو کوئی اعتراض نہیں، تو ایک اسلامی مملکت میں قرآن وسنّت کا نظام قائم کرنے پر دوسری اقوام کو اعتراض کیوں کر ہونا چاہیے۔ ایسی صورتِ حال دیکھ کر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ہماری مملکت کے وہ افراد جو آج کلیدی مناصب پر بیٹھے ہوئے ہیں، مغربی تعلیم اور اُس کی تہذیب سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں، اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے خوف کے بجائے ایسی نام نہاد سپر پاوروں کا خوف بیٹھا ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے ایک کمزور تنکے کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ ع

کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شد

کوئی بھی میدانِ عمل میں سامنے نہیں آرہا، آخر سواروں کو کیا ہو گیا۔ علمائے اُمّت اپنی سی کوشش کر رہے ہیں، چاہے اُن کا کسی بھی مسلک سے تعلق ہو۔ قرآن وسنّت کے عملی نفاذ کے سلسلے میں تمام اہالیانِ پاکستان کو بلاتفریقِ مسالک ایک ہو جانا چاہیے۔ مشائخ عظام کو اِس معاملہ میں علماء کا ساتھ دینا ضروری ہو گیا ہے۔ اپنے آپ کو خانقاہی نظام تک محدود نہ رکھیں بلکہ اعلائے کلمۂ حق کی خاطر آواز بلند کریں، لوگوں کو اپنے مواعظِ حسنہ سے غیرت دلائیں، اُن کے قلوب کو گرمائیں، اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے حلقۂ اثر کو اپنی تحریر وتقریر سے بہرہ ور کریں اور اسلام کی صحیح تصویر اُن کے سامنے پیش کریں۔ یہ خاموش بیٹھنے کا وقت نہیں ورنہ اِس بے جا خاموشی کے متعلق کل قیامت کو پوچھا جائے گا کہ تم لوگ اپنے اپنے مفادات کے حصول کی خاطر تو گلے پھاڑ پھاڑ کر بولتے رہے، مجالس گرم کرتے رہے۔ اپنی شان وشوکت دکھاتے رہے، ہماری عطا کردہ دولت واقتدار کے بل بوتے پر عیش وعشرت کی زندگیاں بسر کرتے رہے۔ مگر جب میرے دین اور میرے قانون کے مقابلے میں طاغوتی قوتوں نے سر اُٹھایا تو تم نے چُپ سادھ لی۔ اِن حساس لمحات میں تم سب بے حس کیوں بن گئے، تم سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ کلمۂ حق کیوں نہیں کہا، اپنی صلاحیتوں کو میری راہ میں پیش کیوں نہیں کیا۔ میرے اور میرے رسولؐ کے نام پر لوگ تمہاری عزت کرتے رہے، تمھیں بھاری بھرکم نذرانے پیش کرتے رہے، تمہارا غیر معمولی ادب واحترام بجالاتے رہے، تمھیں مافوق الفطرت قوتوں اور تصرفات کا مالک سمجھتے رہے۔ آج اِن سب باتوں کا حساب دو۔ علماء ومشائخ کو بالخصوص یہ باتیں ذہن میں رکھنے کے ساتھ خود اِن پر عمل پیرا بھی ہونا چاہیے تاکہ عوام الناس اُن کی تقلید کریں اور آہستہ آہستہ من حیث القوم لوگوں کے اندر اسلامی اقدار وشعائر کا احترام اور شعور پیدا ہو سکے۔ اگر موجودہ دور کے علماء ومشائخ ملک میں نفاذِ شریعت کا تہیہ کرلیں اور بلاتفریق مسالک ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو کوئی طاقت ملک میں نظامِ شریعت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی۔

جو اسلامی مملکت اللہ، اُس کے احکام اور اُس کے رسول کی شریعت کی بالادستی کو عملاً نہ نافذ کرتی اور نہ تسلیم کرتی ہو، نہ وہ اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق ہے اور نہ اُس کے سربراہ مسلمانی کے دعوای

میں سچے ہوسکتے ہیں کیوں کہ ایمان صرف زبان ودل کی تصدیق ہی کا نام نہیں، بلکہ اُسے حسبِ قدرت اپنے اوراپنی حدودِ تصرف میں نافذ کرنے کا نام بھی ہے۔ خلفائے راشدین کا دورِ مقدس اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگر وہ اسی پر اکتفا کر لیتے کہ ہم نے رسولِ خدا کی معیت میں برسوں گزارے ہیں، ہمیں درجۂ صحابیت بھی حاصل ہے۔ ہمارے لیے رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کی بشارت قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ ہمارے اور ہمارے دورِ حکومت کے لیے رسولِ خدا کی واضح بشارات احادیث کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ ہمیں شریعتِ محمدیہ کو عملاً نافذ کرنے اور رات دن کے ذہنی دباؤ میں وقت گزارنے اوراپنی جان کو مصیبت کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر انہوں نے ایسا سوچا بھی نہیں۔ اپنی ساری منصوص فضیلتوں اور خداداد مقامات ومراتب کے باوجود نہ صرف یہ کہ اللہ ورسول کا قانون اپنی زیرِ تصرف زمین پر عملی طور پر نافذ ورائج کیا، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ جیسی مشکل ترین منازل سے بھی گزرتے رہے، دوسری اقوام کو اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دیتے رہے، شعائرِ اسلامیہ کی عزت وحرمت کا تادمِ زیست پاس بھی فرماتے رہے۔ اللہ ورسول کی شریعت کے نفاذ کے لیے بڑی بڑی طاغوتی طاقتوں سے ٹکر بھی لی۔ طرح طرح کی مصیبتیں بھی جھیلیں۔ فقر وفاقہ کی زندگی بھی گزاری، انتہائی دیانت داری سے وقت گزارا، والیِ سلطنت اور سربراہِ مملکتِ اسلامیہ ہونے کے باوجود عام آدمی کے رہن سہن کو اپنایا، پھر ہر لمحہ اللہ تعالیٰ سے خائف رہے اور اپنا ہر ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا تا کہ صراطِ مستقیم کسی قیمت اُن سے نہ چھوٹ سکے۔ اگر خلفائے راشدین جیسی فقید المثال ہستیاں اور عظیم شخصیات مسلمان ہونے کے ناتے خود کو نفاذِ شریعت کے سلسلے میں عنداللہ جواب دہ سمجھتی ہیں تو آج کا وہ کونسا سربراہِ مملکت یا اسلامی حکومت ہے، جو مادر پدر آزاد ہو کر قیامت کی باز پرس سے خود کو مستثنیٰ خیال کر سکتی ہے۔

یہ کیسی اسلامی مملکت ہے کہ جس میں آج تک انگریز کا قانون چل رہا ہے۔ قرآنِ مجید کے نزدیک وہ مدعیانِ ایمان جو اپنے اندر اللہ کے قانون کو نافذ نہ کریں، وہ اپنے زعم کے مطابق تو مؤمن ہوں گے، مگر اللہ کے نزدیک مومنین میں نہیں، ظاہر ہے کہ جب وہ خود مومن نہ ہوئے تو

جس ملک میں وہ سانس لے رہے ہیں، اسلامی ملک کیسے کہلا سکتا ہے۔ قرآنِ مجید کے اس فیصلے کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۔

"اے میرے رسول کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو خیال کرتے ہیں کہ وہ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل شدہ احکام پر ایمان لے آئے اور ایسے لوگ اپنے فیصلے طاغوت کی طرف لے جاتے ہیں، حالانکہ اُن کو طاغوت کے انکار کا حکم دیا گیا"۔

گویا ایسی مملکت اور ایسے مدعیانِ ایمان قرآنِ مجید کے نزدیک مؤمن نہیں، ہاں اگر اپنے خیال میں اپنے آپ کو مسلمان اور مملکت کو اسلامی مملکت سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔ ایسے ایمان کا کیا فائدہ کہ جسے کائنات کا خالق ہی قبول نہ فرمائے یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہوئی نا۔

بہر حال یہ ساری امتِ مسلمہ کے لیے بالعموم اور پاکستان میں بسنے والی امتِ محمدیہ کیلئے بالخصوص لمحۂ فکریہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی بے حسی، بے عملی اور بے اتفاقی کا یہی عالم رہا تو قیامت کے دن اس کا ذمہ دار کون ٹھہرایا جائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے دربار میں کل کیا جواب دیں گے۔

آج ہمارے اسلامی معاشرے کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اس میں بسنے والے اونچے طبقہ سے لے کر متوسط اور نیچے طبقات تک کا ہر فرد کسبِ معاش کی فکر میں ہے، جن کے پاس زندگی گزارنے کی بنیادی سہولتیں موجود نہیں اُن کا تلاشِ رزق میں سرگرداں رہنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر وہ طبقات جو مال ودولت اور زندگی کی ضروری اور غیر ضروری سہولتوں سے مکمل طور پر بہرہ ور ہیں، افسوس یہ ہے کہ وہ ضرورت مندوں سے کہیں زیادہ دنیا کمانے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس میں دینی، مذہبی اور روحانی مناصب سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی دنیا داروں کے شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ کوئی بچ گیا ہو تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آج مسلمانوں کے تمام طبقات اور جملہ مسالک سنتِ رسول کے اتباع پر زور دیتے ہیں کہ سنت کے مطابق داڑھی رکھنا، عمامہ باندھنا، مسواک

استعمال کرنا، غرض فلاں فلاں عمل کرنا سنتِ رسول ہے اور اِن کا تارک گناہ گار اور فاسق و فاجر ہے۔ کیا اِن تمام اتباعِ سنت کے مدعیان نے کبھی اِس پر عمل کر کے دکھایا کہ حرصِ دنیا کا ترک کرنا بھی سنت میں داخل ہے، رات دن روپے کمانے کے چکر میں ہلکان نہ ہونا بھی سنت ہے، خواہشاتِ نفسانیہ کو پورا نہ کرنا بھی سنت ہے۔ سود نہ کھانا بھی سنت ہے۔ یتامیٰ اور مساکین کا مال غصب نہ کرنا بھی سنت ہے۔ کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ نہ کرنا بھی سنت ہے، پڑوسیوں کے حقوق کا لحاظ رکھنا بھی سنت ہے۔ روپے پیسوں کا جمع نہ کرنا بھی سنت ہے، جائیدادیں نہ بنانا بھی سنت ہے۔ علاوہ ازیں تلاوتِ قرآنِ مجید کرنا اور اِس کے مطالب تک رسائی حاصل کرنا بھی سنت ہے۔ نماز، روزہ کی پابندی بھی سنت ہے۔ فکرِ آخرت کرنا بھی سنت ہے۔ موت کو یاد رکھنا بھی سنت ہے۔ جملہ حاجات اور مشکلات میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا بھی سنت ہے۔ اِسی طرح حضور علیہ السلام کے عقائد کے عین مطابق اپنے عقائد کو بحال رکھنا اور اُن سے سرِ مو اِدھر اُدھر نہ ہونا قرآن و سنت کا واضح حکم ہونے کے ساتھ ایمان کی شرطِ اوّلین بھی ہے۔ آج ہم مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے اگر اپنے اپنے عقائد کا عقائدِ رسالت مآب سے موازنہ کریں تو ہم پر ہمارے عقائد کی بے اعتدالیاں کھل کر سامنے آسکتی ہیں۔ کیوں کہ قرآنِ مجید نے کسی بھی مسئلہ یا معاملہ میں اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ایمان والوں کو حکم دیا ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُم فِی شَیئٍ فَرُدُّوہُ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُولِہٖ کہ اگر تمہارا کسی بھی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کے سامنے پیش کرو، وہاں جو حکم تمہیں ملے اُس پر عمل کرو۔ مزید فرمایا:

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُونَ حَتّٰی یُحَکِّمُوکَ فِیمَا شَجَرَ بَیْنَھُم ثُمَّ لَا یَجِدُوا فِی اَنْفُسِھِم حَرَجاً مِمَّا قَضَیتَ وَیُسَلِّمُوا تَسْلِیْماً قسم ہے تمہارے رب کی کہ (مدعیانِ ایمان) اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات کو آپ کے سامنے پیش نہ کریں، پھر آپ کے صادر کردہ فیصلے پر اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں (یعنی اُسے خندہ پیشانی

سے بسروچشم قبول کریں) اور اِس طرح اُس فیصلے کو تسلیم کریں، جیسے تسلیم کرنے کا حق ہے۔ تب جا کر کہیں مؤمن کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ مگر اِن عقائد و مسائل کا قرآن و سنت سے موازنہ کرنا عوام کے بس کا کام نہیں، کیوں کہ وہ علومِ شرعیہ کے ماہر ہوتے ہیں نہ عالم۔ یہ کام اہلِ علم کا ہے، چاہیے کہ ہر مسلک کا سربراہ عوام کے سامنے اپنے پیش کردہ عقائد و مسائل کا قرآن و سنت سے موازنہ کرے اور جو بات قرآن و سنت کے مطابق نہ ہو، اُس سے برأت کا خود بھی اعلان کرے اور اپنے مقلدین کو بھی آگاہ کرے اور جن جن مسالک کی جو جو باتیں اور جو جو عقائد اُسے قرآن و سنت کے عین مطابق نظر آئیں، اُن کو جان و دل سے خود بھی تسلیم کرے اور عوام کے سامنے اُن چیزوں کے برحق ہونے کا برملا اظہار بھی کرے۔ اِس عمل کے لیے للّٰہیت کا ہونا شرطِ اوّل ہے اور نیت کی درستگی ضروری ہے۔ مگر مادیت پرستی اور نفسا نفسی کے اِس نازک دور میں اتنی فرصت کسے حاصل اور اتنا علمی تبحر کسے نصیب کہ وہ قرآن و سنت سے آج کے عقائد و مسائل کے موازنہ کی شکل کو اپنے ذمہ لے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلک کے لوگ آنکھ بند کیے ہوئے اپنے اپنے قائدین کے پیچھے چل رہے ہیں، کسی میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں کہ وہ اپنے کسی عقیدہ کے خلاف ذہن میں اُٹھنے والے سوال کو کھل کر کسی کے سامنے پیش کر سکے، اِس کی وجہ یہ خوف ہے کہ اُس پر اپنے ہم مسلک ہی بغاوت کا الزام نہ لگا دیں کہ یہ آدمی دوسرے کسی مسلک کا ہمنوا بن گیا ہے۔

اِسی وجہ سے کئی سو سالوں سے مختلف مسالک کی کھچڑی پک رہی ہے اور ہر مسلک نے اپنے ساتھ مسلمان ہونے کا لیبل لگایا ہوا ہے۔ اگر سارے مسالک درست قرار دیے جائیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ معاذ اللہ قرآن و سنت کے احکام و عقائد میں اِس قدر تضاد چہ معنی دارد۔ اِس لیے یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قرآن و سنت کے کسی حکم میں کوئی تضاد نہیں، یہ تضاد ہماری سمجھ اور اندازِ فکر میں ہے۔ مختلف مسالک کے اِس ہجوم میں جب کہ ہر مسلک اپنی اپنی بولی بول رہا ہے، مجھے جو مسلک قرآن و سنت کے زیادہ قریب نظر آیا یا محسوس ہوا، وہ اہل السنۃ والجماعت کا مسلک ہے، یہ بات میں قطعاً اِس لیے نہیں کہہ رہا کہ میرے آباء و اجداد کا اِسی مسلک سے تعلق چلا آیا ہے۔ میں

آزاد طبع آدمی ہوں، قرآن وسنّت کی کچھ سمجھ بوجھ بفضلہٖ تعالیٰ مجھے بھی حاصل ہے۔ مجھے طویل عرصہ تک غور کرنے اور اہل السنۃ والجماعت کے عقائد ومسائل کے قرآن وسنّت سے موازنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ دنیائے اسلام میں اگر افراط وتفریط سے محفوظ کوئی مسلک ہے تو وہ اہلِ سنّت و جماعت کا مسلک ہے۔ میں اِسی علمی براہین ودلائل کی دنیا کے حوالے سے ائمۂ اربعہ کی علمی عظمتوں کا قائل ہوا۔ اگر سوال یہ کیا جائے کہ ائمۂ فقہ میں بھی ہزاروں مسائل مختلف فیہ تھے، اب ہم کس کو صحیح اور کس کو غلط قرار دیں۔ تو اِس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ائمۂ فقہ کا باہمی اختلاف بعض فروعی مسائل میں ہے، وہ امور جو دین کے اصول کا درجہ رکھتے ہیں، اُن میں سب متفق ہیں اور پھر جن فروعی مسائل میں اُن کا باہمی اختلاف ہے وہ بھی محض اپنی اپنی دکانیں چمکانے اور امت میں تفریق ڈالنے کی بنا پر ہرگز نہیں، بلکہ دلائل کی بنا پر ہے۔ اِس کے باوجود وہ ایک دوسرے پر تکفیر وتفسیق کے فتوے لگانے کے قائل نہیں، بلکہ چاروں ائمۂ فقہ بعض امور میں اختلاف کے باوجود باہمی احترام کے قائل ہیں اور ایک دوسرے کو اہلِ سنّت میں شمار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھیں عہدِ رسالت سے قرب حاصل تھا۔ اُن میں سے بعض نے صحابہ اور بعض نے تابعین وتبع تابعین کے نہ صرف عہد کو پایا بلکہ اُن سے علوم وفنون کا اکتساب بھی کیا۔ ذہنی اعتبار سے یہ لوگ انتہائی مضبوط، بالغ نظر اور قرآن وسنّت سے متعلق جملہ علوم وفنون پر کلی دسترس رکھتے تھے۔ زہد وتقوٰی، بے نفسی، بے ریائی، ترکِ دنیا اور ترکِ حرص وہوا اِن کا شعار تھا۔ اسلامی علوم کی تحصیل کے لیے دُور دراز کے سفر اِن کا دستور تھا۔ تقوٰی اور تزکیۂ نفس کے سبب اِن کے قلوب آئینوں کی طرح شفاف تھے۔ نفسانی خواہشات اور ہوسِ دنیا سے اِن کے دامن پاک تھے۔ انھوں نے وہ چہرے دیکھے اور اُن قدسی صفات عظیم انسانوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں جو ھُم قومٌ لا یشقیٰ جلیسھم کا مصداقِ اتم تھے۔ اِس لیے اگر آج کا کوئی مدعیِ اجتہاد اپنے آپ کو اُن پر قیاس کرتے ہوئے دروازۂ اجتہاد کھول کر بیٹھ جائے اور خود کو وقت کا ابوحنیفہؒ سمجھے یا کہلانا شروع کردے تو بلاشبہ اُس کا یہ عمل اہلِ دانش کے نزدیک درست نہ ہوگا۔ ہاں اگر اُن کی تقلید کی روشنی میں جدید مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرے اور اُن کی عظمتوں کا لحاظ بھی

رکھے تو اہلِ علم اُس کی ضرور قدر کریں گے۔ آج کا وہ طبقہ جو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی تقلید کو ضروری نہیں سمجھتا، بلکہ لوگوں کو بھی اِن کی تقلید واتباع سے روکتا ہے، وہ شدید غلطی پر ہے۔ اگر اِس غیر مقلد طبقہ کے پاس اتنا علم ہے تو میدانِ عمل میں ذرا اتر کر اُن مسائل کا دلائل کے ساتھ رد پیش کرے جن مسائل کو ائمۂ اربعہ نے قرآن وسنّت کے دلائل کی روشنی میں حل کیا ہے۔ محض کسی کی مخالفت کرنا اور بات ہے اور دلائل سے رد کرنا اور اپنی بات کو دلائلِ قطعیہ کی روشنی میں ثابت کرنا بالکل اور بات ہے۔

جس زمانے میں ہم "نور الانوار" سبقاً پڑھتے تھے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان اختلافی مسائل پر فریقین کے قائم کردہ دلائل کو دیکھ کر حیران ہو جاتے تھے اور اکثر مسائل میں جب امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے اصحاب کے دلائل کا امام شافعیؒ اور اُن کے اصحاب کے دلائل پر غلبہ دیکھتے تو امام ابوحنیفہؒ کی علمی عظمتیں دل میں مزید جاگزیں ہو جاتی تھیں۔ جن لوگوں نے علم سے بے رغبتی اور دنیا کی طرف رغبت کے سبب ہمارے اِن اکابرِ اُمّت کے دلائل وبراہین کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور باقاعدہ اِن کے حصول کی خاطر کسی ماہر استاد کے سامنے زانوئے تلمذ ہی تہ نہیں کیا، اُن کو کیا خبر کہ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر ائمہ کے مقاماتِ اجتہاد اور اُن کی بصیرتِ علمی کی بلندیاں کیا ہیں۔

بقولِ عارف جامیؒ ؎

مستیِ بادۂ عشقش زمنِ مست مپرس
ذوقِ ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

چوں کہ ہم نے اِس مضمون کے ابتدائی اوراق میں مال ودولت اور ہوسِ دنیا کے ترک پر قرآن و سنّت کی روشنی میں کافی کچھ لکھا ہے اور بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ دنیا کی ہوس ہر برائی کی جڑ ہے، انسان جب تک ہوسِ دنیا کی دلدل سے نہیں نکلے گا، کسی کارِ خیر کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے انسانوں میں آج جس قدر اور جس نوعیت کا اختلاف اور نفرت پائی جاتی ہے، تلاش کرنے کے بعد اِس سارے اختلاف اور نفرت کی جڑ دنیا کی ہوس اور مال ودولت کی محبت نکلے گی۔ جن خوش نصیب

لوگوں کو ہوسِ دنیا سے رونما ہونے والے مفاسد کا علم ہو گیا، وہ اِس سے دامن کش ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا محور مقاصدِ عالیہ کو بنالیا، وہ علمِ دین کے حصول میں مصروف ہو گئے، قرآن وسنّت اور کائنات کے دوسرے علوم وفنون کے حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیائے علم میں وہ نام اور وہ مقام دیا کہ اہلِ دولت بلکہ سلاطینِ وقت نے اُن کے جوتوں میں بیٹھنا اپنے لیے باعثِ فخر ومباہات سمجھا۔ علم وعمل کا یہ سلسلہ مولا علیؓ سے چلا تو نسلاً بعد نسلٍ غوثِ جلیؒ، ہندالولیؒ اور مہرِ علیؒ تک پہنچ گیا۔ اِن کے پاس دنیا کا مال ومتاع تو نہ تھا کیوں کہ اللہ نے اِسے قرآنِ مجید میں متاعِ قلیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِنہوں نے علم وحکمت کی دولت کو حاصل کرنے کی سعی فرمائی کیوں کہ اللہ نے قرآن میں حکمت کو خیرِ کثیر فرمایا ہے۔ اِس خیرِ کثیر کو اِس طبقہ نے اِس وافر مقدار میں حاصل کیا کہ اِس کا نور تا قیامت آنے والی نسلِ انسانی کے لیے کافی رہے گا۔ بقولِ میرزا عبدالقادر بیدلؔ

بیش ازانست در آئینۂ من مایۂ نور
کہ بہر ذرّہ دو خورشید نمایم تقسیم

کہ اگر میں کائنات کے ہر ہر ذرّے کو دو دو سورج بھی عطا کروں تو میرے خزانۂ نور میں موجود نور کا سرمایہ ختم ہونے والا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے نائبین اولیاء اللہ اپنی ظاہری حیات میں بھی اِسی خزانۂ علم کو خلقِ خدا میں اُن کی استعداد دیکھ کر تقسیم فرماتے رہے اور دنیا سے جانے کے بعد بھی اُن کے علمی فیض کا سلسلہ جاری وساری ہے، جو قیامت تک جاری رہے گا۔ فارسی کے مشہور اُستاد بابا فغانیؔ نے ایک شعر کہا تھا، جس کا تعلق اِسی طبقۂ عالیہ سے ہے، فرماتے ہیں ۔

مردِ صاحب دل رساند فیض در موت و حیات
شاخِ گل چوں خشک گردد وقتِ سرما آتش است

صاحب دل یعنی اللہ کا ولی اپنی موت وحیات دونوں میں برابر فیض دیتا ہے۔ اِس بات کو اِس مثال سے سمجھئے کہ پھول کی شاخ جب سبز ہو تو پھول کھلاتی ہے اور جب خشک ہو جائے تو سردیوں

میں آگ کی صورت میں لوگوں کو نفع دیتی ہے، اب رہی یہ بات کہ یہ طبقہ اگر قبروں میں زندہ ہے تو پھر موت کا اِن پر اطلاق کیوں کیا گیا۔ اور اِن کی حیات بعد الموت کی کیفیت کیا ہے۔ یہ الگ موضوع ہے، جس پر کبھی پھر کچھ لکھا جا سکتا ہے اور اِسے بہ دلائلِ قطعیہ ثابت بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں اپنا ایک پنجابی شعر لکھ رہا ہوں اگرچہ اِسے شرعی دلائل کا درجہ ہرگز حاصل نہیں مگر اتنا ہے کہ میں نے یہ شعر قرآن وسنّت کے دلائلِ ساطعہ اور براہینِ قاطعہ کی روشنی میں کہا ہے، جسے میں وقت آنے اور ضرورت پڑنے پر ان شاء اللہ مخالفینِ حیات بعد الموت کے سامنے ثابت کر سکتا ہوں، عرض کیا ہے ۔

جے زندہ نہیں ولی قبراں دے اندر
زمانہ ایویں دیوے بال دا اے

اللہ تعالیٰ ہمیں حرصِ دنیا کی آفت سے محفوظ رکھے، حسد، بغض، کینہ پروری، ریاکاری، خوئے تملّق اور تکبّر جیسی مہلک اور موذی بیماریوں سے نجات دے اور اپنے عبادِ صالحین اور اولیاء اللہ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے، کیوں کہ ہمارا عظیم ترین سرمایہ صرف قرآن وسنّت، پھر اہلِ بیت وصحابہ، اولیائے کرام اور فقہائے عظام کا اتباع واحترام ہے ۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

●